تاثرات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وفات

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کی دوپہر سے زیادہ سخت، الم انگیز اور جانکاہ ساعت پہلے کبھی نہیں آئی تھی اور شاید آئندہ بھی کبھی نہ آئے گی۔ اس دن ہمارے ادارہ کے بانی اور ناظم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم غفر اللہ لہٗ حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے! انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم خلیفہ صاحب اسلامی مجلس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کراچی گئے تھے۔ اس کے چار جلسوں میں شریک ہوئے اور اگلے جلسہ کی صدارت کرنے والے تھے۔ ۳۰ جنوری کو صبح مرکزی وزیر تعلیم جناب حبیب الرحمٰن سے ملے اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ کو مزید ترقی دینے کی تجاویز پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے بعد اسی سلسلہ میں وزارتِ مالیات میں جناب عبدالمجید صاحب سے ملاقات کی اور پھر جناب ممتاز حسن صاحب سے ملنے گئے اور ان ہی کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً راہی دار البقا ہو گئے۔ اس طرح مرحوم خلیفہ صاحب کے آخری لمحات بھی اسی ادارہ کی فلاح و ترقی کی کوشش میں صرف ہوئے جو انہی کے ہاتھوں قائم ہوا اور انہی کی رہنمائی میں ترقی کر کے اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ادارہ بن گیا۔

یہ کوئی سوا بجے دوپہر کا واقعہ تھا۔ اسی وقت مرحوم کے اہل و عیال کو لاہور میں ٹیلیفون کے ذریعہ اس سانحہ کی اطلاع دی گئی اور پانچ بجے شام کو ریڈیو پاکستان سے یہ المناک خبر نشر ہوئی۔ مرحوم کے اہل و عیال، احباب و اقربا اور اہل ادارہ سب کے لیے یہ خبر انتہائی روح فرسا تھی۔ ان کے دل و دماغ اس اچانک حادثہ کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور کیوں ہوتے جب کہ کوئی ایسی ظاہری علامت موجود نہ تھی جس سے حاشیہ وہم و گمان میں ایک لحظے کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا کہ ایک قابلِ صد رشک صحت و تندرستی کا مالک اس طرح یکایک ابدی مفارقت کا داغ دے جائے گا۔ خلیفہ صاحب کی لاش بذریعہ طیارہ لاہور لائی گئی اور دوسرے دن گیارہ بجے جنازہ اٹھا اور احباب و اقربا اور علم و ادب کے قدر شناسوں کے ایک کثیر ہجوم نے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں ان کے والد خلیفہ عبدالرحمٰن مرحوم کے پہلو میں دفن کیا۔ چند سال قبل خلیفہ صاحب نے اپنے والد محترم کی قبر پر سنگِ مرمر لگوایا تھا اور ایک طرف یہ اشعار لکھوائے تھے:

ما بہ فلک بودہ ایم ، یارِ ملک بودہ ایم

باز ہماں جا رویم، یار، کہ آں شہر ماست
منزلِ ما کبریاست

اور کسے معلوم تھا کہ اس منزل کی طرف مرحوم خلیفہ صاحب بھی اس قدر جلد جادہ پیما ہو جائیں گے۔

بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ زندہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ زندگی انہیں یوں ہی نہیں مل جاتی بلکہ کچھ خدمات ایسی ہوتی ہیں جو انہیں زندہ رکھتی ہیں۔ مرحوم خلیفہ عبدالحکیم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ ان کی علمی اور دینی خدمات اور ان کی بلند انسانیت ایسی ہے جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

مرحوم کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی اور ان جیسی جامعیت رکھنے والے لوگ آج نظر نہیں آتے۔ ایک طرف وہ بلند پایہ مفکر و فلسفی تھے تو دوسری جانب اعلیٰ درجے کے مصنف و ادیب تھے۔ قادر الکلام شاعر بھی اور بلند پایہ مقرر بھی۔ اور شعر و ادب کا ذوق تو اتنا پاکیزہ اور لطیف تھا کہ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو تقریر و تحریر میں ایک ہی درجہ رکھتے ہوں اور پھر نثر و نظم دونوں میں یکساں کمال کے حامل ہوں۔ مرحوم خلیفہ صاحب میں یہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔

ان کی علمی جامعیت عجیب انداز کی تھی یعنی وہ قدیم و جدید، دنیوی و دینی اور مشرقی و مغربی تمام طرح کے علوم پر یکساں حاوی تھے۔ ہر جہت میں وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور پھر حافظہ بھی اتنا قوی تھا کہ بعض اوقات حیرت ہوتی تھی۔ شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شاعر ایسا ہوگا جس کا منتخب کلام انہیں یاد نہ ہو۔ اسی طرح کوئی فلسفی بھی ایسا نہ تھا جس کے افکار انہیں ازبر نہ ہوں۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں کے صاحب طرز ادیب تھے۔ اس کے علاوہ جرمن، فارسی، کشمیری اور پنجابی پر بھی کامل عبور تھا۔ عربی اور سنسکرت میں بھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ انہیں اظہار مافی الضمیر پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ زبان میں بڑی سلاست اور مٹھاس تھی۔ بڑے ادق مسائل کو بھی وہ نہایت سادہ لفظوں میں آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔ ساتھ ہی غضب کی قوتِ استدلال تھی۔ عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل گویا خود ان کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بات بات میں نکتہ پیدا کرتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاح اور طبیعت میں ان کا جواب نہ تھا۔ کبھی لفظی مزاح اور ضلع جگت ہوتا اور کبھی معنوی انداز کی ظرافت و شگفتگی ہوتی۔ اور اپنے مضمون کے مطابق ٹھیک موقعے محل کے شعروں کا انتخاب تو ایک ایسا وصف تھا جو انہیں پر ختم ہو گیا۔

ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ حیدر آباد دکن میں گزرا جہاں وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور میر شعبۂ فنون تھے۔ اردو زبان سے انہیں بڑا شغف تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کامیاب جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا۔ مرحوم کے کتبِ فلسفہ کے تراجم اور دوسری ابتدائی تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور واپس آئے اور یہاں انہوں نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنا ڈالی اور یہی ان کی زندگی بھر کی آرزوؤں کا مرکز تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دورِ حاضر کے بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی افکار کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور اسلام کی اساسی اقدار اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے نیز اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول دنیا کے سامنے اس طرح پیش

کئے جائیں کہ ایک طرف تو جدید مادہ پرستی کے ان پست رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ ہو جو انکارِ خدا کی وجہ سے اسلامی فلسفۂ زندگی کے نقیض ہیں اور دوسری جانب اسلام کی اساسی اقدار کی محافظت اس انداز سے ہو کہ تنگ نظری دُور ہو جائے اور اسلام ایک جامد مذہب بن کر نہ رہ جائے بلکہ ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔

مرحوم کی تقریر و تحریر دونوں کا مرکزی مقصد یہ تھا کہ اسلام کی حقیقی اور اعلیٰ تعبیرات پیش کی جائیں کیونکہ وہ اسلام ہی کو ایک ایسا دین سمجھتے تھے جس میں حرکت و ارتقاء کے تمام ممکنات مستور ہیں اور جس کے اصول ابدی ہیں۔ وہ جمود سے متنفر تھے۔ ان کی تشریحات و تفسیرات میں ایسی جان تھی کہ دین سے برگشتہ طبقے کو بڑی آسانی سے دین سے وابستہ کر دیتے تھے اور مغرب و مشرق کے متشککین کو تو ایسی تسلی بخشتے تھے کہ ان کو مجالِ فرار و انکار نہ ہو سکتی تھی۔

ان میں رسولِ کریمؐ کی محبت اور دینی حمیت کمال درجے کی تھی۔ ہم نے وہ صحبتیں دیکھی ہیں جہاں ان کی دینی غیرت جوش میں آجاتی تھی۔ اس وقت ایک مواج سمندر کی طرح مضامین اُبلتے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کسی مخاطب کی دل آزاری نہ ہونے دیتے تھے۔ مخاطب سے خود اسی کے مسلمات کی روشنی میں گفتگو کرتے تھے جس کے بعد اسے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ ہو سکتا تھا۔ مرحوم میں تنگ نظری اور عصبیتِ جاہلیہ نام کو نہ تھی۔ وہ دوسروں کے مذہبی احساسات کا بڑا احترام کرتے تھے خواہ وہ کسی مشرب و ملت کا ہو اور سامع پر اس انداز کا بھی خاصا نفسیاتی اثر پڑتا تھا۔

اپنی اسی فراخ دلی اور وسعتِ نظر کی وجہ سے وہ مختلف ممالک میں مذہبی مباحث میں حصہ لینے کے لیے مدعو کئے جاتے تھے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ان مذاکرات میں شرکت کرتے تھے اور جہاں بھی جاتے اسلام کے تفوق و برتری کا غیر فانی نقش ثبت کر کے آتے۔

مرحوم خلیفہ صاحب کا کردار بہت بلند تھا۔ انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ فکر و غم اور یاس کو پاس نہیں آنے دیتے تھے۔ ہر وقت شگفتہ رہتے تھے اور تمام تلخیوں کو دو لطیفوں میں ختم کر دیتے تھے۔ وہ ہر بات کا روشن پہلو دیکھتے تھے اور اپنی زندہ دلی و شگفتہ مزاجی سے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے تھے۔ اپنے ہر چھوٹے بڑے ملنے والے سے وہ یکساں قریب تھے۔ افسری جتانے کا ادنیٰ سے ادنیٰ جذبہ بھی نہ تھا۔ ماتحتوں سے ان کا برتاؤ انتہائی نرم اور شریفانہ تھا۔ سخت گیری سے وہ کوسوں دُور تھے۔ وہ ہر ایک کے ہمدرد اور مخلص دوست تھے۔ رفقائے ادارہ سے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی ہمیشہ برابر کی سطح پر ملتے تھے۔ بڑا ہو یا چھوٹا دونوں طرح کے لوگوں سے وہ مساویانہ ہی برتاؤ کرتے۔ حسنِ ظن ان کی فطرت میں داخل تھا۔ جب تک عملی تجربہ نہ ہو جائے وہ کسی سے بدظن نہ ہوتے تھے۔ ادارہ کے کارکنوں کی ہر ممکن ہمدردی کرتے تھے۔ رفقائے ادارہ کو ہر ممکن سہولت دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ تصنیف و تالیف کا کام بڑا دماغی سکون چاہتا ہے اس لیے کام کرنے والوں کے سکون میں کوئی خلل نہ آنے دینا چاہیے حتیٰ کہ تصنیفی کاموں میں بازپرس بھی نہ کرتے تھے۔ رفقاء کو گرمیوں میں کسی سرد مقام پر جانے کی اجازت دیتے تھے بلکہ سفری سہولتیں بھی مہیا کرتے تھے۔

یوں تو ہر محفل میں ان کی شخصیت ان کے علمی مذاکرے کی وجہ سے مرکز توجہ بن جاتی تھی لیکن ادارے کا یومیہ گھنٹے دو گھنٹے کا اجتماع کچھ ایسا دلچسپ ہوتا تھا کہ اس کی شرکت کے بغیر نہ انہیں چین آتا تھا نہ رفقائے ادارہ کو۔ ہم پر حاضری کی کوئی قانونی پابندی

نہ تھی لیکن ہم سب حاضری پر خود مجبور تھے۔ یہ صحبتیں ہی کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ اگر کسی سخت مجبوری کی وجہ سے نہ آسکتے تو دل پر ایک بوجھ محسوس ہوتا تھا اور وقت پھیکا پھیکا گزرتا تھا۔ یہاں کی صحبتوں میں ہر روز کسی خاص موضوع پر گفتگو ہوتی۔ ہم سب پوری آزادی سے اپنی اپنی رائے دیتے اور پھر جب خلیفہ صاحب مرحوم اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہماری معلومات یا رائے کے کمزور پہلو خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس وقت ان کی گفتگو میں فلسفیانہ افکار بھی ہوتے اور منطقی استدلال بھی۔ تفسیر و حدیث بھی ہوتی اور فقہ و کلام بھی۔ سخن ور شعراء کا کلام بھی ہوتا اور لطائف و ظرافت بھی۔ تمثیلات بھی ہوتیں اور شگفتہ بذلہ سنجی بھی۔ تنقید بھی ہوتی اور تبصرہ بھی۔ انگریزی، اردو، فارسی بھی ہوتی اور مغربی زبانوں کے حوالے بھی۔ اس کے باوجود جب ہم کوئی وزنی نکتہ بیان کرتے تو اسے بے چون و چرا مان لیتے۔ بعض اوقات دورانِ گفتگو میں کوئی ایسا مضمون نکل آتا کہ مرحوم ہم لوگوں کے مشورے سے اس موضوع پر کتاب لکھنے کی فرمائش کر دیتے۔ رفقاء کی صلاحیتوں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ کونسا رفیق کس قسم کا کام بہتر کر سکتا ہے۔ اس لیے کوئی نیا موضوع پیدا ہونے کے بعد وہ کسی ایک رفیق سے مشورہ کر کے وہی کام اس کے سپرد کر دیتے۔ کچھ ضروری نکات و خطوط کی نشاندہی کر کے مصنف کو آزاد چھوڑ دیتے۔ میعادِ معین کے درمیان کبھی کبھی پوچھ لیتے کہ کام کی رفتار کیا ہے اور کہاں تک کام ہوا ہے۔ اگر میعاد سے زیادہ وقت لگتا تو بڑے نرم و لطیف انداز سے توجہ دلاتے کیونکہ تحقیق و تصنیف کی نزاکتوں کو وہ خوب سمجھتے تھے۔

مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دس گیارہ سال ادارہ کے لیے وقف کر دیئے۔ اور اس زمانے کو اپنی زندگی کا بہترین دور سمجھتے تھے۔ یہ ادارہ ان کے لیے ایک مقصدِ حیات کا درجہ رکھتا تھا۔ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پیش کئے گئے جو ادارے کی ڈائرکٹری سے کہیں زیادہ نفع بخش تھے لیکن انہوں نے ہر پیش کش کو رد کر دیا۔ وہ یوں تو بہت سے اداروں سے وابستہ رہے۔ کسی کے صدر، کسی کے سیکریٹری، کسی کے رکن اور کسی کے سرپرست۔ لیکن وہ ایسی ہر وابستگی کو یہ دیکھنے کے بعد ہی منظور کرتے تھے کہ اس سے ادارہ کے کام میں تو رکاوٹ نہ ہوگی۔ مستقبل کے متعلق ان کے عزائم بہت بلند تھے لیکن افسوس کہ ان عزائم کی تکمیل سے پہلے ہی ان کا رشتۂ حیات منقطع ہو گیا۔ مرحوم خلیفہ صاحب نے جس دینی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا وہ اپنی ضرورت اور افادیت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور یقینِ کامل ہے کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اپنے بانی کے کام کو جاری رکھنے اور اپنے تمام مقاصد حاصل کرنے میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔